Masnavi ka Fan aur Irtaqa

B.A Urdu (Hons), part-iii, paper-viii

مثنوی ایک مربوط بیانیہ نظم ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں اور سارے اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مثنوی کے عمدہ ہونے کے لیے بیتوں اور مصرعوں کے ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ ایک بیت دوسرے بیت اور ایک مصرع دوسرے مصرعے سے بالکل چسپاں ہو۔

تکنیک کے اعتبار سے تمام اصناف سخن سے زیادہ آزادی مثنوی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں نہ قصیدہ کی طرح ابیات کی تعداد محدود ہوتی ہے، نہ غزل کی طرح ردیف وقوافی کی قید۔ اس لیے بیانیہ شاعروں کی تمام وسعتیں اس میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مناظر قدرت، فلسفہ وتصوف کے طویل مباحث، حسن وعشق کے فسانے، رزم وبزم کی داستانیں، اس صنف سخن میں بخوبی ہوجاتی ہیں۔ اور واقعہ نگاری کے لیے تو مشرق کی شاعری میں اس سے بہتر کوئی اسلوب ہے ہی نہیں۔

مثنوی نظم کا فن ہے لیکن چونکہ اس میں داستانوں کو نظم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں نظم کی خارجی تکنیک اور قصہ کے داخلی تکنیک دونوں کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ اچھی مثنوی کے لیے تسلسل کا ہونا لازمی ہے۔ اور اس میں ارتقاء لَو سبک ہونا چاہیے تاکہ ابتداء، وسط اور عروج کا احساس ہو، اس میں پلاٹ، کردار، پس منظر، ماحول اور فضا نگاری کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ بیان کے لحاظ سے مثنوی کا فن ترجیحی ہے، اس لیے زبان صاف اور رواں ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس صنف سخن کے لیے بہ اعتبار موضوع بحریں مخصوص کی ہیں:

(ا) متقارب مثمن مقصود یا محذوف یعنی فعولن، فعولن، فعول یا فعل۔

فردوی کا شاہنامہ، قطامی کا سکندر نامہ، سراج کی بوستان خیال اور میر حسن کی مثنوی اسی بحر میں ہے۔

(۲) ہزج مسد مقصدو یا ہزج مسدس اخرب مقبوض۔ یعنی مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل۔ اس بحر میں نظامی کی شیریں خسرو، جامی کی یوسف زلیخا اور فیض کی نل دمن وغیرہ ہیں۔

(۳) بحر رمل مسدس مقصود یا محذوف، یعنی فاعلاتن، فاعلاتن یا فاعلات۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی، میر حسن کی رموز العارفین۔ اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی وغیرہ اسی بحر میں ہیں۔

(۴) بحر خفیف مسدس مجنون یا مقصود یعنی فاعلاتن، مفاعلن، فعلن یا فعلات جس میں حدیقہ سناتی۔ جامی کی سلسلہ الذہب اور آفتاب الدولہ قلق کی طلسم الفت وغیرہ ہیں۔

(۵) بحر ہزج مسدس اخرب محذوف یعنی مفعول، مفاعلن، فعلون، اس میں گلزار نسیم اور ترانۂ شوق وغیرہ ہیں۔

(۷) بحر متقارب مثمن اثر مقبوض یعنی فاع فعولن فعلن فاع یا فعلن فعلن فعلن فاع ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے یہ بھی کہا ہے کہ میر حسن نے سحر البیان میں جو بحر استعمال کی ہے وہ غلط ہے۔

اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اردو میں شعر و شاعری کا چرچا شروع کیا اور یہ بھی مثنوی سے کیونکہ اصلاح و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کے لیے یہ مناسب صنف ہے۔ یہ مثنوی کا فن ہی ہے جو برعکس غزل کے شاعر کو اظہار خیال کی وسعتیں فراہم کرتی ہیں۔ غزل کے برعکس مثنوی نے واقعات کے تسلسل اور ترتیب سے اظہار بیان کو ممکن بنا دیا۔ ابتدائی صوفی شاعروں میں شاہ میراں جی ہیں جنہوں نے شہادت الحق، نام کی مثنوی لکھی جو اسلوب بیان اور زبان کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ نصرتی نے ایک طویل مثنوی موسوم بہ علی نامہ، اور دوسری ''گلشن عشق'' لکھی تو بحری نے مثنوی ''من لگن''

تحریر کیا۔ یہ مثنویاں فن کے لحاظ سے تو نہیں لیکن تاریخ کی حد تک اہمیت کی حامل ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے سید میر ہاشمی نام کے ایک دکنی شاعر کا ذکر کرتے ہوئے ''یوسف زلیخا'' نامی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جس کا عہد تصنیف نصرتی اور بحری سے قبل بتاتے ہیں، بہمنی سلطان محمد قطب قلی شاہ نے ہندوستانی پھلوں اور جڑیوں کو اپنی مثنوی کا موضوع بنایا ہے۔ غواصی، ابن نشاطی، تحسین الدین، فائز وغیرہ نے بہمنی دور میں مختلف قصوں کی بنیاد پر مثنویاں لکھیں۔

ولی دکنی بحیثیت غزل گو شاعر ایک اہم مقام کے حامل ہیں لیکن اردو مثنوی کی تاریخ میں بھی ان کا ایک تاریخی مقام ہے۔ انہوں نے واقعات کربلا کو نظم کرتے ہوئے ''روضۃ الشہدا'' نام کی ایک مثنوی تصنیف کی اس مثنوی کی زبان پچھلی مثنویوں کے مقابلے میں زیادہ صاف اور بہتر ہے۔ فضلی نے اس مثنوی کو نثر کا جامہ پہنایا جو ''وہ مجلس'' کے نام سے مشہور و مقبول ہے۔ ولی کے بعد اردو مثنوی کی تاریخ میں اورنگ آباد ہی کے ایک شاعر سراج کا نام آتا ہے جنہوں نے ایک طویل مثنوی ''بوستان خیال'' تصنیف کی۔ یہ مثنوی اپنی مثال واہمیت آپ رکھتی ہے۔

غزل کی طرح مثنوی میں بھی زیادہ تر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ اس میں ردیف وقوافی کی پابندیاں بہت آسان ہیں اور خیالات کے اظہار کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ ابتداء مثنوی میں صرف تسلسل اور قافیہ کی پابندی ضروری تھی۔ مگر وقت گذرنے کے ساتھ اس میں اور بہت سی باتیں شامل کرلی گئیں۔ منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ سمجھی گئی کہ قصیدہ کی طرح مثنوی میں بھی چند چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً حمد، نعت، منقبت، تعریف بادشاہ، تعریف سخن، قصیہ یا واقعہ پھر خاتمہ لیکن درحقیقت سبھی مثنوی نگاروں نے اس کا اہتمام ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ مثنوی کا تعلق فارم ہی سے صرف نہیں خیال سے بھی ہے۔ ابتدائی دور مثنوی نگاری میں جیسا کہ قبل عرض کیا گیا ہے مذہبی خیالات کی اشاعت اور ترسیل کے لیے اس صنف کو اپنایا لیکن بعد کو اس میں قصے کہانیاں بھی نظم ہونے لگیں۔ مجاز کے پردے میں کبھی کبھی حقائق ومعرفت کی بھی باتیں ہوتی رہیں۔

مثنوی نگاری کے سلسلے میں جب دہلی پر نظر پڑتی ہے تو پہلا نام شاہ مبارک آبرو کا آتا ہے جنہوں نے

''آرائش معشوق'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ آبرو کے بعد خان آرزو، حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں کا نام آتا ہے۔ لیکن اس وقت تک مثنوی نگاری دکنی شعرا کے سرمائے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اس دور کے بعد میر اور سودا کا دور ہے جو اردو شاعری کی بڑی ترقی کا دور ہے۔ تمام اصناف سخن بہ شمول مثنوی اس عہد میں انتہائے کمال کو حاصل کیا۔ اسی دور میں میر حسن جیسا باکمال مثنوی نگار ہوا۔ میر حسن کے ذکر سے پہلے میر سوز، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میر سوز کے دیوان میں غزل اور رباعیوں کے علاوہ مثنوی بھی موجود ہے جو صفاتی وسلاست کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ مرزا رفیع سودا کا اصل میدان اگرچہ قصیدہ اور ہجو تھا لیکن اس صنف مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی اور چوبیس مثنویاں لکھیں جن میں لطائف، حکایات اور پہلیاں نظم کی گئی ہیں۔ میر تقی میر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔ ان میں مثنوی زدرنامہ، مثنوی شعلہ عشق، مثنوی جوش عشق، مثنوی دریائے عشق، مثنوی اعجاز عشق، مثنوی خواب وخیال اور مثنوی معاملات عشق اہم ہیں۔ اگرچہ میر تقی میر کی مثنویاں میر حسن کی مثنویوں تک نہیں پہنچتیں لیکن مثنوی نگاری کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اردو مثنوی نگاری میر حسن کے ہاتھوں عروج کو پہنچی اور انہوں نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سحر البیان، رموز العارفین، گلزار ارم، خوان نعمت مقبول عام ہیں۔ ان میں مثنوی سحر البیان جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، زبان کی سادگی، سلاست، روانی، صفائی، شائستگی، برجستگی اور انداز بیان کی جاذبیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۷۸۵ء ہے۔ اس کے بعد جن لوگوں نے مثنوی نگاری کے میلان کو وسیع کیا ان میں انشاء، جرأت، رنگین، حسرت، دہلی، منیر شکوہ آبادی اہم ہیں لیکن میر حسن کے بعد مثنوی نگاری کی صنف کو وقار دینے والے پنڈت دیا شنکر نسیم ہیں۔ ان کی مثنوی ''گلزار نسیم'' مقبول عام ہے۔ کیونکہ ''گلزار نسیم'' لکھنؤ کی نمائندہ ترین مثنوی ہے اور اسی سے دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑتی ہے۔ دیا شنکر نسیم کا دور لکھنؤ کی فارغ البالی کا دور تھا۔ سحر البیان اور اگلزار نسیم میں واضح فرق یہ ہے کہ سحر البیان اگر سادگی بیان جذبات نگاری گھلاوٹ اور حقیقت نگاری کا نمونہ ہے تو ''گلزار نسیم'' صناعی، حسن کاری، چست بندش، نادر تشبیہات اور واقعہ نگاری کی عمدہ مثال۔

نسیم کے بعد قلق کا نام آتا ہے انہوں نے کئی مثنویاں لکھیں جو محض لفظی تصنعات سے پر ہیں۔لیکن طلسم الفت، زبان و بیان دونوں ہی خوبیوں سے مملو اور قابل قدر ہے۔اور نواب مرزا شوق قدوائی بھی اپنی اہمیت آپ رکھتے ہیں۔مغلیہ حکومت کے آخری دور میں مومن، ذوق، غالب اور داغ جیسے نامور شعرا ہوئے ہیں ان میں مومن اور داغ کا نام ہی مثنوی نگاری کے سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ان کی مثنویاں قابل قدر ہیں۔

دور جدید کے اثرات سے اردو ادب کی مختلف اصناف کی طرح مثنویوں کو بھی اثر پذیر کیا۔مثنوی کو حقیقت سے قریب لانے کی کوشش ہوئی اور اس سلسلے میں بھی الطاف حسین حالی کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے مناظرہ تعصب وانصاف، رحم وانصاف، برکھارت وغیرہ مثنویاں لکھیں۔ان کی زبان سہل اور طرز ادا فطری ہے۔ان میں مقصدیت بھی ہے۔اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کا نام بھی قابل ذکر ہے۔آزاد نے بھی حالی کی طرح ہی جدید طرز کی مثنویاں لکھیں۔ان میں مثنوی شب قدر، حب وطن، ابر کرم، اور صبح امید قابل ذکر ہیں۔ان کے بعد بھی یہ سلسلہ برقرار رہا۔

Dr. H M Imran

Deptt. of Urdu,

S S College, Jehanabad

Contact: 9868606178